ڈاکٹر نازیہ ملک
اسسٹنٹ پروفیسر شعبہ اردو، نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد۔

خالدہ حسین کی افسانہ نگاری عصری حقائق کی ترجمان

Short story of Khalid Husain:As depictions of fats in Modern Age

Khalida Husain established herself as a short story writer during '60s. She presented in her writings the contemporary political, social and economic facts in an impressive way. During the decade of '60s, the new short story being produced was different in its style and reasons which it initially received from its time. This is the reason that Khalid Husain's stories are a construction of the contemporary facts and inner feelings. She presents mystic ideas and the problem of existentialism in her stories. From this perspective, the anthologies of her stories: "Darwaza", "Pehchaan", Masruf Aurat are a reference to her contemporary consciousness. The paper under study explores her contemporary consciousness in her short stories.

Key words: Contemporary, Political, Social, Economic, Construction, Existentialism, Anthologies.

فن اگرچہ معاشرے میں رونما ہونے والے حالات و واقعات، ارضی و فکری تبدیلیوں اور معاشی عوامل سے اپنا مواد حاصل کرتا ہے مگر وہ براہ راست مرقع نگاری اور مصوری کے بجائے شعور اور لاشعور میں جمع ہو کر عصری حقیقتوں کو ادب کے رنگ میں سامنے لاتا ہے۔ کیونکہ ادب میں سارے رویے فکری سطح پر پرورش پاتے ہیں اور یہ فکری سطح انسانی تجربات و مشاہدات کی روشنی میں ادب کی تخلیق کے لیے راہ ہموار کرتی ہے۔

ساٹھ کی دہائی نہ صرف اردو افسانے بلکہ پورے اردو ادب میں ایک نئے عہد کا آغاز ہے۔ اس کا پس منظر کچھ یوں ہے کہ قیام پاکستان کے بعد جب فسادات کا لاوہ ٹھنڈا ہوا تو بعض نئے حقائق سامنے آنے شروع ہوئے۔ لوٹ مار کا بازار گرم ہوا۔ مفاد پرست عناصر میدان میں آئے جس سے وہ خواب چکنا چور ہوئے جو ایک نئے وطن کے بارے میں مسلمانوں نے اپنی آنکھوں میں سجائے تھے۔ اور اس کے ساتھ ساتھ ۱۹۵۸ء کا مارشل لاء جس نے جمہوریت اور آزادی اظہار کے بارے میں ہر طرح کی امید کو دھندلا کر رکھ دیا، یہ ایسے حالات تھے جنھوں نے نئی فکر کے پنپنے کا ساماں کیا۔ اس طرح پچاس کی دہائی کے آخر اور ساٹھ کی دہائی کے اوائل میں جو افسانہ لکھا گیا اس میں ایک نئی

ریاست کے لوگوں کا احوال بھی درج تھا۔ افسانے میں سب سے بڑی تبدیلی اس کے اسلوب میں آئی۔ جدید افسانے میں انتظار حسین، انور سجاد، خالدہ حسین قابل ذکر ہیں۔ جنھوں نے نئے اسلوب سے رشتہ استوار کر کے روایت سے اثر قبول کیا اور اپنے دور کے رجحان ساز افسانہ نگار قرار پائے۔ ۱۹۶۰ء کا عشرہ اردو افسانے کی تاریخ میں مرکزی حیثیت رکھتا ہے جس نے افسانے کا چلن ہی بدل دیا۔ اس حوالے سے ڈاکٹر رشید امجد کہتے ہیں کہ:

> "ہمارے نئے ادبی رویوں کا آغاز ۱۹۶۰ء میں ہوا، مارشل لاء کا چہرہ اس کی صورت ایک وجہ ہے۔ علامتی طرز صرف جبر کی پیداوار نہیں بلکہ اس کی وجہ یہ احساس بھی تھا کہ اب پرانے پیرائے میں بات کہنا ممکن نہیں اور اگر اظہار ہیئت و تکنیک کے لیے تجربات سے گریز کیا گیا تو تکرار لازمی ہو جائے گی"۔ (۱)

پاکستان میں جدید ادب کی تحریک کا زمانہ ۱۹۵۸ء کے مارشل لاء کے پاکستان میں جدید ادب کی تحریک کا زمانہ ۱۹۵۸ء کے مارشل لاء کے بعد اور ۶۰ کی دہائی میں شروع ہوتا ہے۔ اس سے قبل ترقی پسند تحریک ختم ہو چکی تھی۔ جس کی وجہ سے سماجی و معاشی موضوعات پر لکھنے کا عمل سست پڑ گیا تھا۔ تقسیم ہند کی وجہ سے نئے مسائل سامنے آئے تھے اور نیا ملک کئی نئی ضرورتیں اور تقاضے، نئے انداز اور نئی فکر کا متقاضی تھا۔ ترقی پسند عہد کی پہچان زیادہ تر سماجی حقیقت نگاری تھی جو بہت حد تک اپنے امکانات کھو چکی تھی۔ جب ۱۹۵۸ء کا مارشل لاء نافذ ہوا اور جمہوری آزادیوں اور اظہار بیاں پر پابندی عائد ہوئی تو جہاں ایک طرف نئی فکر کی ضرورت محسوس کی جانے لگی تو دوسری طرف نئے اسالیب بیاں بھی سامنے لانے ضروری ہو گئے۔ ۶۰ء کی دہائی کے آغاز پر جدید نظم کی تحریک کا آغاز ہوا جس کا اثر افسانے پر بھی پڑا۔ آغاز میں انتظار حسین نے "آخری آدمی" کے نام سے کہانی لکھی۔ اس کہانی میں داستانی اور اساطیری انداز کو اختیار کیا گیا تھا۔ اس کے نتیجے میں کچھ دیگر لکھنے والے بھی سامنے آئے جن میں انور سجاد اور خالدہ حسین کا نام لیا جا سکتا ہے۔ نئے لکھنے والوں نے علامتی اور تجریدی انداز اختیار کیا۔ اور زبان و بیاں میں نمایاں تبدیلیاں پیدا کیں۔ بقول شہزاد منظر:

"ساٹھ کے عشرے کے افسانے کی نمایاں خصوصیات یہ ہیں کہ افسانے کی مروجہ روایتی اور مسلمہ ہیئت کو توڑنے اور افسانے کو تجسیمی صورت کی جگہ اسے تجریدی صورت دینے کی شعوری کوشش شروع ہوئی۔[۲]

جدیدیت صرف تکنیک، اسلوب اور ہیئتوں کے تجربوں کا نام نہیں بلکہ اپنے زمانے کے حقائق کی شناخت اور ان سے ذہنی ربط کے بغیر جدیدیت کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ پاکستان میں جس زمانے میں جدید ادب لکھا گیا اس عہد کے آشوب کو سمجھنا بھی بہت ضروری ہے۔ ایوب خان کے مارشل لاء نے ایک ایسی نئی قوم کے لیے جس کے خواب شکست خوردہ ہوچکے تھے کئی طرح کے ذہنی اور روحانی مسائل پیدا کیے۔ ادب میں جو آزادی کا دور دورہ تھا اس پر قدغن لگ گئی۔ جس میں پرانا پیرایۂ اظہار ناکام ہو گیا۔ اور اس نے ادیبوں کو ایک نئی زبان وضع کرنے پر مجبور کیا۔ لیکن اس سے بھی زیادہ یہ ہوا کہ تہذیبی اقدار میں جو نئے ماحول کے باعث تبدیلیاں پیدا ہونا شروع ہوئیں اس نے انسان کے داخل پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ معاشرے کا جو نیا اخلاقی ڈھانچہ بننے لگا اس میں اجتماعیت کے بجائے فردیت کا رویہ بننے لگا اور ساٹھ کی دہائی کے جدید ادب میں یہی رویہ کام کر رہا ہے۔

سیاسی تبدیلیوں کی یہ بازگشت اردو افسانے میں گھٹن، خوف اور بے چینی کی صورت میں اظہار پانے لگی۔ پرانے ادبی ڈھانچوں نے نئے عصری تقاضوں کا ساتھ دینے سے انکار کر دیا۔ تب ایک نیا اسلوب علامتی شکل میں سامنے آیا جس نے خاموشی کے ساتھ افسانے کو ایک نئی راہ پر گامزن کر دیا۔ اس طرح معاشی عدم تحفظ کا احساس علامت کی شکل میں ابھرنے لگا۔ شہزاد منظر جدید افسانے میں مسائل کے بیان کے حوالے سے لکھتے ہیں:

"جدید افسانہ نگاروں کا زندگی اور اس کے مسائل کو سمجھنے اور اسے پرکھنے کا انداز فطری تھا۔ اس لیے انھوں نے صنعتی دور کے انسان کی معاشی بدحالی اور سماجی پس ماندگی کے مقابلے میں اس کی فکری اور جذباتی ناآسودگی انسان کی داخلی شخصیت کے بکھراؤ، اقدار کی شکست و ریخت، صنعتی معاشرے میں انسان کی تنہائی، نیز زندگی کی معنویت اور ذات کی تلاش جیسے موضوعات کو

اہمیت دی اور اس کے اظہار کے لیے انھوں نے بیانیہ اسلوب کی بجائے علامتی طرز اظہار کو اپنایا۔[۳]

وجود کے تشخص کے حوالے سے خالدہ حسین بہت اہمیت کی حامل ہیں۔ ان کی کہانیاں خارجی حقائق اور باطنی کیفیات سے تشکیل پاتی ہیں۔ انھوں نے اپنے افسانوں میں متصوفانہ خیالات اور وجودی مسائل کو پیش کیا ہے۔ اس حوالے سے ان کا مجموعہ ''دروازہ'' اور ''پہچان'' قابل ذکر ہیں۔ جس میں انھوں نے وہ موضوعات چنے ہیں جو عورت کا وہ روپ ہے جس میں عدم تحفظ، تشکیک، شناخت کے بحران اور نفرت، لاحاصلی، افتادگی وغیرہ جیسے موضوعات کو علامتی انداز میں تشکیل دیا ہے۔

خالدہ حسین نے ۶۰ کی دہائی میں علامتی و تجریدی ادب کے حوالے سے اپنی پہچان بنائی۔ ان کے افسانوں میں ہمیں ۶۰ کی دہائی کی عصری صورتحال نظر آتی ہے۔ ان کے افسانوی مجموعے ''پہچان'' اور ''دروازہ'' ان کے عصری شعور کا مکمل حوالہ ہیں۔ ان کے افسانوں میں فنا کے زبردست احساس، زندگی کی کم مائیگی، بے معنویت، شکست آگہی اور پراسرار تاریک راہوں پر بھٹکنے کا شدید احساس ملتا ہے۔ تنہائی، موت، یقینی اور بے یقینی اس حوالے سے ان کے افسانے ''رپورتار''، ایک بوند لہو، سواری، ہزار پایہ، نام کی کہانی، شہر پناہ وغیرہ خاصے اہم ہیں۔ ان سب افسانوں کے کرداروں کے رویے وجودیت سے متاثر ہیں اور گہرے کرب میں مبتلا نظر آتے ہیں۔ ان کے ان افسانوں کے اقتباس ملاحظہ کیجیے:

سونے کے لیے جب میں بستر میں لیٹا مجھے اپنے جسم کا بوجھ اپنے سے الگ محسوس ہو رہا تھا۔ جیسے میں کسی اور کا جسم اٹھائے پھر رہا ہوں۔ میں خاموش لیٹا اندھیرے میں جھک کر دیکھتا رہا۔ میرے اپنے دل کی دھڑکن میرے اپنے کانوں میں گونجتی رہی۔ پھر میں ایک دم چونک گیا۔ برابر کے کمرے میں مدھم سی روشنی ہو رہی تھی اور ماں کے کراہنے کی آواز آ رہی تھی۔ اپنڈکس کا درد۔ میں بے خبری ہی میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ ماں کی آواز اب صاف آ رہی تھی۔ قے کی وہ بھیانک آواز جس سے میرا تمام جسم لرز جاتا تھا۔ مگر اس وقت وہ محض ایک آواز تھی جس کو میں پہلے بھی سن چکا تھا۔ میرے دل

میں وہ گہرا دکھ نہ جاگا، جب میرا جی چاہتا تھا کہ ماں کی گود میں سر رکھ کر پھوٹ پھوٹ کے رونے لگوں۔ میں دروازے کے ساتھ لگا ماں کی آواز سنتا رہا۔ (۴)

پھر اس جامد لمحے کی موت کے شدید انتظار میں میرا ذہن بالکل شل ہو گیا چنانچہ وہ انتظار بھی مر گیا۔ میں نے اپنے آپ کو فراموش کر دیا۔ اپنے آپ کو یوں فراموش کر دینے میں بڑا سکون تھا۔ جیسے انسان کے جسم کا بوجھ ختم ہو جائے۔ ایک مکمل توازن جو اسے فضا میں معلق رکھے۔ (۵)

میں اکیلا رہ گیا سب چلے گئے۔ اس نے میرے گرد اپنی کانپتی باہوں کی گرفت سخت کر دی۔ اس کی دھڑکتی پسلیاں میرے جسم میں چبھنے لگیں۔ تیزی سے بہنے والے آنسو میرے ہاتھوں پر انگاروں کی طرح گرنے لگے۔ تب میرا رواں رواں کسی جان لیوا آگ میں جل اٹھا۔ جیسے کسی نے ابلتا لاوا ڈال کر مجھے ایک گہرے، سحر زدہ خواب سے جگا دیا ہو، میں نے انجانے ہی میں لہو ٹپکاتے احساس کو چھو لیا تھا۔ اور اس لمس کا زہر میرے تمام جسم میں گھل گیا تھا۔۔۔ موت کا وہ لمحہ مر چکا تھا۔ میں ایک تنہا اور خوف زدہ انسان ایک دوسرے تنہا، خوف زدہ انسان کے سینے کے ساتھ سر لگائے، سسکیاں بھر رہا تھا۔ اور تمام کائنات میں سائیں سائیں کرتی، تنہا رات بھری تھی۔ (۶)

ان کے افسانے رپورتاژ میں وحشت اور خوف کی ایسی مثال ہے جو موت کے گہرے احساس میں جنم لیتی ہے۔ کہانی کا مرکزی کردار ایک انجانے سفر کی تیاری میں مصروف ہے۔ یہ سفر اذیت اور کرب ناک ماحول پیدا کرتا ہے۔ اسی دوران وہ برتن دھونے کے لیے پڑوس سے پانی لاتے ہیں لیکن پانی پر پہرہ بٹھا دیا جاتا ہے۔

پانی پچھواڑے کے کنوئیں سے آتا تھا مگر اب پانی پر ہتھیار تانے وہ کھڑے رہتے تھے۔
جب پانی آزاد تھا تب لڑکی ڈول میں پانی بھر لاتی تھی۔ اب شام ہوئے یہ میں جاتا تھا۔
پہلی شام جب میں نے ان بہت سوں کو ہتھیار تانے دیکھا تو مجھے ہنس آ گئی۔ میں نے پکارا
اماں پانی قید ہو گیا۔ (۷)

کنوئیں سے پانی لانے کا سوچتے ہیں تو کنواں خشک ہو جاتا ہے اور پتھروں سے بھر جاتا ہے۔ جسے اندھا کنواں کہتے ہیں۔

> اب وہاں کوئی بھی بولنے والا نہیں تھا۔ انھوں نے زبانیں کاٹ ڈالی تھیں اور اندھے کنوئیں ان بولتی کٹی زبانوں سے بھر گئے تھے۔ اور وہ ایک دوسرے سے کہتے تھے، دیکھو کنویں کا پانی زمین چوس گئی ہے۔ اور اب یہاں پتھر بھرے پڑے ہیں۔ مگر پتھر ہلتے ہیں اپنے آپ۔ (۸)

ابھی مرکزی کردار نے سفر پر روانہ ہونا ہوتا ہے کہ اتنے میں ہتھیاروں والے آجاتے ہیں اور جبراً ہتھیاروں والے انھیں پکڑ کر لے جاتے ہیں۔

> وہ سب کے سب دروازہ دھکیل کر اندر آ گئے اور ہتھیار تانے ہمارے پیچھے ہو لیے۔ تم انھیں کہاں لے جا رہے ہو؟ میں نے چلا کر کہا۔ مگر وہ ہمیں دھکیلتے ہوئے دروازے سے باہر لے گئے۔ باہر میں نے ان سب کو دیکھا جو جا چکے تھے اور اندھے کنویں جن میں پتھر تڑپتے تھے اور انھوں نے میرے ہاتھ میں بھی زبانوں کے پتھر تھما دیئے اور ہم خالی اندھے منہ کے ساتھ چلتے رہے۔۔۔ وہ ہتھیار تانے ہمارے پیچھے تھے اور کہتے تھے: دیکھو زمین پانی چوس گئی ہے۔ دیکھو اندھے کنوئیں میں پتھر بھرے ہیں۔ (۹)

اس افسانے میں دراصل ہتھیاروں والے، اندھا کنواں، پانی پر پہرہ، یہ تمام اس عہد کے جبر کی اور انسان کی بے بسی کی صورتحال ہے جسے خالدہ حسین نے علامتی انداز میں پیش کیا۔ ان کے افسانے سواری اور ہزار پایہ میں بھی موت کا دکھ اور جبر کی کیفیت ملتی ہے۔ افسانہ سواری کا مرکزی کردار ایک حساس طبیعت کا شخص ہے جسے ہونے والے واقعات کے بارے میں پہلے سے علم ہو جاتا ہے۔ اور شہر میں ایک عجیب سی سواری چل رہی ہے جس کے بارے میں کسی کو علم نہیں ہے۔

> اس مہک نے شہر میں دہشت کو عام کر دیا تھا۔ گو کوئی بھی بظاہر دہشت کو تسلیم نہ کرتا تھا مگر سب ہر لمحے کسی ان جانے حادثے کے خوف سے سہمے رہتے تھے اور وہ سہم کچھ بے جا بھی نہ تھا کہ چند ہی ہفتوں بعد آخر وہ حادثہ رونما ہوا۔ (۱۰)

ان کے افسانے ''سواری'' میں آغاز سے آخر تک لاعلمی، محرومی، کم ہمتی اور عدم تحفظ کا احساس بہت گہرا نظر آتا ہے۔ ناکامی کے باوجود کہانی کے کردار آگے بڑھنے کے لیے ہاتھ پیر مار رہے ہیں۔ یہ کردار بڑے پر اسرار ہیں۔ ان کرداروں کی حسیں جب کام کرنا ختم کر رہی ہیں تو کہانی کے مرکزی کردار سے امید بندھ جاتی ہے کہ وہ کچھ کرے گا۔ اور وہ کردار پل پر کھڑا سواری کا انتظار کر رہا ہے کہ اب اس کی باری ہے۔

خوف اور عدم تحفظ کی فضا ''شہر پناہ'' میں بھی پائی جاتی ہے۔ اس افسانے کے مرکزی کردار کو اپنا سارا وجود گھپ اندھیرے میں ڈوبتا نظر آتا ہے۔ یہ اندھیرا اس کے کانوں اور آنکھوں میں اٹک جاتا ہے۔ یہاں تک کہ سانس لینے سے وہ کالک اس کے اندر چلی جاتی ہے۔ اور خوف سے وہ مخبوط الحواس ہو جاتا ہے۔ اس افسانے میں دراصل گہری رمزیت اور اشاریت ملتی ہے۔

> دراصل اسے منظر خوفزدہ کرتے تھے۔ حادثے نہیں کیونکہ منظر تو وجود پانے سے پہلے ہی اس کے ذہن میں موجود ہوتے اور اسے معلوم ہوتا کہ جب وہ باہر کی دنیا کے سامنے آن کھڑے ہوں گے تو کتنے بھیانک ہوں گے۔ بہر حال یہ مناظر اور حادثوں کی بات ہی بڑی الجھی سی تھی۔ (۱۱)

خالدہ حسین کے افسانوں میں عصری آگہی کے حوالے سے ڈاکٹر شفیق انجم لکھتے ہیں کہ:

> ان کے کردار ایک پر اسرار دہشت اور خوف میں مبتلا نظر آتے ہیں۔ پہچان کے گم شدہ ہو جانے اور زندگی کی بے معنویت کا المیہ ان کرداروں سے ہمہ وقت چپکا نظر آتا ہے۔ خالدہ حسین نے اس المیے کو بارہا اپنی ذات کے حوالے سے پیش کیا۔ موت، تنہائی، اداسی اور بے معنویت کو انھوں نے عصری مفاہیم میں بھی دیکھا دکھایا اور خود اپنی ذات کے خلا میں بھی ان کی حیثیت مرتب کرنے کی سعی کی۔ (۱۲)

ان کے افسانے ''نام کی کہانی'' میں خوف کی عصری صورتحال دیکھیے:

> اول تو یہ نام بھول جانے کا قصہ ہی عجیب تھا کہ حرف سب کے سب موجود تھے اور مل کر ایک نام اب بھی بناتے تھے۔ اور اسے یہ بھی معلوم تھا کہ یہی اس کا نام ہے مگر مشکل یہ تھی کہ پہلے یہ لفظ وہ خود تھی مگر اب وہ محض خول تھا۔ وہ اس کے اندر موجود

نہیں تھی۔ اب معلوم نہیں کہ اصل نام وہ خول تھا۔ یا وہ خود، اس کا کوئی نام نہیں تھا۔
اسی لیے سب کام تھم گئے تھے۔ (۱۳)

آگے چل کر خالدہ حسین کے افسانوں میں یہ خوف اور عدم تحفظ ذات اور پہچان کے حوالے سے سامنے آتا ہے۔ وہ عورت کی بے بسی، مظلومیت اور اس کی لاچاری کی مختلف تصاویریں پیش کرتی ہیں جس سے اندازہ ہوتا ہے۔ کہ وہ عورت کی شناخت اور پہچان کے حوالے سے بھی فکر مند ہیں۔ خالدہ حسین کے افسانوں میں عورت کا جو روپ پیش کیا گیا ہے۔ وہ عدم تحفظ شناخت کے بحران تشکیک، نفرتوں اور غصے سے تشکیل دیا ہوا ہے۔

مگر جب وہ سکوٹر کی پچھلی سیٹ پر اجنبی کے شانے پر ہاتھ رکھ کر بیٹھی تو یک دم ایک عجیب بے چینی اور خوف نے اس کو گھیر لیا۔ ہم یوں بھی تو کر سکتے ہیں کہ یہاں نہ آئیں۔ لوٹ جائیں۔ کر سکتے ہیں ناں، یہ تو نہیں کہ نہیں کر سکتے اور تیر اگلا بھی گھونٹ سکتے ہیں۔ گھونٹ سکتے ہیں ناں! افی نے سکوٹر کا رخ گھر کی طرف موڑتے ہوئے کہا اور غصے میں آکر سکوٹر کی رفتار بے حد تیز کر دی۔ اس کا جی چاہا راہ چلتے لوگوں اور گاڑیوں اور مکانوں میں مصروف انسانوں اور سنیما گھروں میں تماشائیوں اور جہاں جہاں کوئی ہے، تمام دنیا کو موجود لمحے اور اس کی سمت سے نجات دلا دے۔ (۱۴)

دراصل خالدہ حسین نے عدم تحفظ، لاحاصلی، تشکیک اور افتادگی جیسے رویوں کو علامتی انداز میں پیش کر کے ایک عورت کے جذبات محسوسات اور دلی کیفیات کو بڑے متاثر کن انداز میں پیش کیا ہے۔

اس کا جی چاہتا ان کو سب کچھ بتا دے کیا تم نہیں جانتیں ہمیں ابا جی سے شدید نفرت ہے۔ اور امی کے ساتھ کوئی ہمدردی نہیں کیا تم نہیں جانتیں ہم گونگے بہرے اور اندھے ہیں۔ اور بے حد غیر محفوظ ہمارے ارد گرد کوئی فصیل کوئی حصار نہیں یہاں تک کہ سمتیں مر چکی ہیں۔ (۱۵)

سب سے زیادہ انسانوں کی وہ جنس جو میں ہوں۔ جس طرح وقت اس جنس کو کھاتا ہے، کسی کو نہیں کھاتا ہے۔ کسی کو نہیں کھاتا۔ اور لمحہ لمحہ ہمارے گوشت ہماری ہڈیوں سے علیحدہ ہوتے جاتے ہیں اور چمڑے ایک غلاف کی طرح ہمارے گرد لپٹے رہتے ہیں تاکہ کچھ ہماری پہچان ہو سکے اور اس باہر کی پہچان کے اندر کیا اندھے خلا سائیں

سائیں کرتے ہیں۔ اس نے اپنے اوپر ہنسنا چاہا اور اس کا دوسرا نصف چہرہ بھی رو دیا۔ پھر بھی حیرت ہے کہ دیکھنے والے ہمیں وہ دیکھنا چاہتے ہیں جو ہم نہیں۔ (۱۶)

خالدہ کے افسانوں میں عورت اپنی شناخت اور پہچان بنانا چاہتی ہے کہ میں کون ہوں اور میری شناخت کیا ہے۔ خالدہ عورت کو اس کی مکمل شناخت کروانا چاہتی ہیں۔ وہ اپنے افسانوں میں بتاتی ہیں کہ عورت مرد کو اپنا رفیق ساتھی اور اپنی پہچان کا حوالہ سمجھتی ہے۔

> میں نے تمہیں پہلے کبھی نہیں بتایا کہ تم تو اس دنیا کے ساتھ میرا ناتا ہو۔ ورنہ میں تو ریزہ ریزہ اڑتی پھروں جس طرح زمین کی کشش ختم ہو جائے یا جسم کا وزن مر جائے۔ تو تم میرے وجود کا وزن ہو۔ صرف اس لیے میں تمہارے ساتھ سفر کر رہی ہوں۔ (۱۷)

خالدہ نے پڑھی لکھی عورتوں کے مسائل کو بڑے دانشورانہ انداز میں عصری شعور کے ساتھ ملا کر پیش کیا ہے۔ وہ اپنے عصر کی عورت کا دکھ کرب اور درد دور کرنا چاہتیں ہیں۔ انھوں نے اپنے کچھ افسانوں میں مردانہ بے حسی جو وہ اپنی بیویوں سے روا رکھتے ہیں کو بھی بڑے متاثر کن انداز میں بیان کیا ہے۔ اس حوالے سے ان کا افسانہ ''دھند'' اہم ہے۔ جس میں انھوں نے ایک ایسے شادی شدہ جوڑے کی کہانی پیش کی ہے جو شادی کے بعد کئی سال اکٹھے رہے مگر ایک دوسرے کو پہچان نہ سکے۔ اس کہانی میں شوہر اپنی گمشدہ بیوی کی رپورٹ درج کروانے پولیس اسٹیشن جاتا ہے لیکن جب پولیس والے اس سے اس کی بیوی کا حلیہ پوچھتے ہیں تو اسے اپنی بیوی کا حلیہ تک یاد نہیں ہوتا۔ اس افسانے میں دراصل مصنفہ نے مرد کی بے حسی کو پیش کیا ہے۔

> تو صاحب آپ پریشان نہ ہوں، رپورٹ درج کر لیتے ہیں۔
> اخبار میں بھی آجائے گا۔
> اللہ کرم کرے گا۔ کہیں لاہور وغیرہ چلی گئی ہوں گی۔
> نہیں سب جگہ پتہ کر چکا ہوں۔
> اچھا لو نام۔۔۔ عمر۔۔۔؟ ویسے ماشاء اللہ ذہن تو ٹھیک ہے نا جی۔ زیادہ پڑھنے لکھنے والوں کا کچھ پتہ نہیں ہوتا۔ اچھا تو کپڑے کس رنگ کے پہن رکھے ہیں۔ کپڑے۔۔۔؟ میں چونکا اور یکدم پھر سناٹے میں آ گیا۔ کپڑے؟ میں نے بہت یاد کرنا چاہا۔ یہ تو میں نے

دیکھا ہی نہیں۔ رنگ؟ کون سا رنگ تھا بھلا۔ میں نے بہت سوچا۔ بہت تصور کرنا چاہا مگر اس کے کپڑوں کا کوئی رنگ میرے ذہن میں نہیں آیا۔ پھر میں نے غور کیا اس کے کسی بھی لباس کا رنگ میرے ذہن میں نہیں آ رہا تھا۔ تو کیا میں نے اتنے عرصے میں اسے دیکھا نہیں۔ نہیں میں اسے دیکھتا تو رہا ہوں۔ مگر میں نے اسے نہیں دیکھا۔
اس دیکھنے کا فرق مجھ پر پہلی بار کھلا۔ ہم لوگوں کو اَن دیکھی آنکھوں سے بھی دیکھ سکتے ہیں۔ اس وقت دھند کا ایک طویل و عریض وقفہ میری یاداشت میں پھیلا تھا۔ ایک بے معنی دھند۔ جوہر مانوس شے اور میرے درمیان حائل ہو گئی تھی۔ میں نے پھر یاد کرنا چاہا۔ کیا پہن رکھا تھا اس نے۔ کس طرح کا لباس۔ کون سا رنگ۔ لباس تو لباس مجھے اس کا جسم بھی کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ محض ایک اسم تھی۔ کام نمٹانے والی کوئی پراسرار مشین۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو ضرور مجھے اس کی تفصیلات یاد رہ جاتیں۔ (۱۸)

اپنے افسانے ''آدھی عورت'' میں خالدہ حسین مرد اور عورت کے منافقت بھرے رشتے کی وضاحت کرتی ہیں۔ اور کہتی ہیں کہ اگر عورت اپنی انا کو ختم کر کے خود کو مرد کے حوالے کر دے تو وہ کامیاب ہو جاتی ہے مگر جہاں عورت اپنی انا کو عزیز رکھتی ہے اپنی پہچان چاہتی ہے وہاں وہ سب کچھ کھو دیتی ہے۔ کیونکہ یہ مرد کا معاشرہ ہے اور اس معاشرے میں صرف مرد اپنی پہچان چاہتا ہے۔

مسز شوکت علی تھیں کہ جن کا شوہر بے حد انٹلکچوئل مشہور تھا۔ اور ان کا کہنا تھا کہ مرد انٹلکچوئل ہو یا جاہل۔۔۔ برابر ہے۔ عورت اور مرد میں جنگ وہی صرف انا کی ہے۔ لہٰذا ہم نے تو پہلے دن ہی اپنی انا شوہر کے سپرد کر دی تھی کہ لو میاں چاہے اس کو دیا سلائی دکھا دو یا جھاڑ پونچھ کے طاق میں رکھ دو۔ ہمیں اس سے کچھ مطلب نہیں۔ اور بقول ان کے خود قلعہ بند ہو گئیں۔ نہ ان کے اصل وجود تک شوہر کی رسائی ہوئی، نہ آشنائی و بیگانگی کا چکر پڑا۔ خوب گزر رہی تھی۔۔۔ ان کا مقولہ تھا کہ میاں بیوی کا رشتہ نہایت ڈپلومیٹک رشتہ ہوتا ہے۔ اور جو کوئی اس حقیقت کو بھولا اسکا بیڑا غرق ہوا۔ لہٰذا سچائی، ضمیر کی ستھرائی کے چکر میں نہ پڑو۔ (۱۹)

خالدہ اپنے افسانوں میں عورت کو اس کی پہچان اور شناخت کا واضح شعور دلانا چاہتی ہیں۔ وہ چاہتی ہیں کہ آج کی عورت عصری تقاضوں کو سمجھے اور معاشرے میں اپنا مقام اور اپنی شناخت کو تسلیم کروائے۔ اسی حوالے سے خالدہ

حسین نے اپنے ایک مجموعے کا نام ''پہچان'' رکھا۔ وہ عورت کو اس کی مکمل پہچان سے آگاہ کروا کے اسے زندگی کے مقصد سے آشنا کروانا چاہتی ہیں۔

خالدہ کے افسانوں میں عدم تحفظ، مایوسی، تنہائی لایعنیت عصری تقاضوں سے متصادم ہو کر پہچان پر منتج ہوتے ہیں اور یہاں سے ان کے افسانے صوفیانہ آہنگ میں ڈھل کر وجود کی حقیقتوں کی تلاش میں روحانیت کی منزل تک جا پہنچتے ہیں۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ عصر کی جبریت و کشیدگی نے معاشرے میں جو خلا پیدا کر دیا تھا اور انسان تنہائی کا شکار ہو گیا تھا اسے خالدہ روحانی سفر کے تحت پر کرنا چاہتی ہیں۔ خالدہ کے ہاں صوفیانہ طرز فکر کا اظہار ملاحظہ کیجیے:

> ہمارے پیارے بندے یونس کو یاد کرو جب چالیس دن اور چالیس راتیں مچھلی کے پیٹ میں اپنے رب کو پکارتا رہا۔۔۔ قاسم چچا کو میں نہ بتا سکی۔ میں بھی مچھلی کے پیٹ میں پناہ گزین ہوئی۔۔۔ چالیس دن۔۔۔ چالیس راتیں۔۔۔ چالیس صدیاں، تم شمار کرو، میری گنتی ختم ہو چکی ہے۔ (۲۰)

> میں اس دشتِ کرب و بلا میں جواب دہ ہوں کہ اب تک لبیک کی صدا میرے سینے میں گھٹی ہے۔ مجھے اس دہکتے الاؤ میں کودنا ہے۔ باوجود اس کے کہ مجھے دیکھنے والا کوئی نہیں ۔۔۔ یار فریدا اوہدی اوہ جانے۔ (۲۱)

> ''زمانے کی قسم بے شک انسان صریح خسارے میں ہے کہ ہم نے اس کو نہایت بلند و برتر بنایا۔ پھر پست سے پست ترین ذلتوں میں ڈال دیا۔ ذلت کی کمر توڑ دینے والی گھٹن اس کو اندھے غاروں میں لیے جا رہی تھی جہاں بدبودار ڈھانچے پڑے سڑتے تھے اور کہتے تھے کہ جو محترم تھا وہ نامحترم ہوا۔ جو خوب تھا وہ ناخوب ہوا۔'' (۲۲)

> میرے پیر و مرشد نے کہا تھا کہ جو شے تمہارے لیے چھت ہے کسی اور کے لیے فرش ہو سکتی ہے تو پھر چھت اور فرش، زمین اور آسمان کی بلندی اور پستی کا تعین کس طرح کرو گے۔ خواب اور بیداری کا فیصلہ کیوں کر ہو گا۔ اور یہ بھی فرمایا کہ اب ہم حالت خواب میں مریں گے تو بیدار ہو جائیں گے۔ (۲۳)

خالدہ حسین کے افسانے ان کے عصری شعور سے آگہی کا مکمل حوالہ دیتے ہیں جو ان کے عہد کی سیاسی صورتحال سے پیدا ہونے والی جبر اور عدم تشخص کی کیفیت تھی۔ اور اس کیفیت سے اس معاشرے کے لوگوں کی سوچنے سمجھنے کی صلاحیت مفلوج ہو کر رہ گئی تھی۔ اس تمام المیے کی بازگشت ہمیں ان افسانوں میں سنائی دیتی ہے۔ ڈاکٹر نگہت ریحانہ کے بقول:

> خالدہ اصغر اپنے موضوعات عام زندگی سے چنتی ہیں۔ روزمرہ کی زندگی میں پیچیدہ سے پیچیدہ تر سچائیاں اور مسائل سر اٹھاتے ہیں۔ اسی زندگی میں جو انہونی باتیں ہوتی ہیں۔ وہ معجزات سے کم نہیں ہوتیں۔ انھیں سے خالدہ اپنے افسانوں کا تانا بانا بنتی ہیں اور انھیں اپنی خام یا اصلی شکل میں پیش کر دیتی ہیں۔ اس پیش کش میں وہ کسی جانبدارانہ یا جذباتی رویے کو دخل انداز نہیں ہونے دیتیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے انداز بیان کی سفاکی قاری کے دل میں تیر کی طرح ترازو ہو جاتی ہے۔ اس طرح عام حقائق بھی خاص حقائق کا درجہ پا جاتے ہیں۔ (۲۴)

غرض خالدہ حسین کے افسانوں میں خارجی حقائق باطنی کیفیات بن کر عصری سچائیوں میں ڈھل جاتے ہیں اور یہ عصری حقائق کو نہ صرف گزرتے وقت کی روداد سناتے ہیں بلکہ آنے والے وقت کا پیش خیمہ بھی ثابت ہوتے ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ خالدہ حسین، ایک بوند لہو کی، مشمولہ پہچان، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور، ۱۹۸۹ء، ص۹۔

۲۔ ڈاکٹر رشید امجد سے ایک انٹرویو، مشمولہ چہار سو، راولپنڈی، ۱۹۹۵ء، ص۸۱

۳۔ شہزاد منظر، پاکستان میں اردو افسانے کے پچاس سال، جامعہ کراچی، ۱۹۹۷ء، ۱۳۰

۴۔ شہزاد منظر، اردو افسانے میں جدیدیت، مشمولہ جدید اردو افسانہ، منظر پبلی کیشنز کراچی، ۱۹۸۲ء، ص۴۷۔۴۸

۵۔ خالدہ حسین، ایک بوند لہو کی، مشمولہ پہچان، ص۱۷

۶۔ ایضاً، ص۱۷۔

۷۔ خالدہ حسین، رپورتاژ، مشمولہ پہچان، ص۱۲۲

۸۔ ایضاً، ص۱۲۵

۹۔ ایضاً، ص۱۲۹۔۱۳۰

۱۰۔ خالدہ حسین، سواری، مشمولہ پہچان، ص۸۲

۱۱۔ خالدہ حسین، شہر پناہ، ایضاً، ص۳۳

۱۲۔ شفیق انجم، ڈاکٹر، اردو افسانہ، (بیسویں صدی کی ادبی تحریکوں اور رجحانات کے تناظر میں)، پورب اکادمی اسلام آباد، ۲۰۰۸ء ص۲۲۶

۱۳۔ خالدہ حسین، نام کی کہانی، مشمولہ پہچان، ص۸۹

۱۴۔ خالدہ حسین، پہچان، مشمولہ پہچان، ص۱۶۶

۱۵۔ خالدہ حسین، ایضاً، ص۱۵۶

۱۶۔ خالدہ حسین، آدھی عورت، مشمولہ دروازہ، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور، ۱۹۸۹ء، ص۹۰

۱۷۔ ایضاً، ص۱۰۶

۱۸۔ خالدہ حسین، میں یہاں ہوتی، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۵ء، ص۴۶۔۴۷

۱۹۔ خالدہ حسین، دروازہ، ص ۹۲

۲۰۔ خالدہ حسین، پہچان، ص ۱۰۷

۲۱۔ خالدہ حسین، دروازہ، ص ۱۰۶

۲۲۔ خالدہ حسین، ادھوری عورت، مشمولہ دروازہ، ص ۹۳

۲۳۔ خالدہ حسین، مصروف عورت، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور، ۱۹۸۹ء، ص ۸۵

۲۴۔ نگہت ریحانہ خان، ڈاکٹر، اردو مختصر افسانہ فنی و تکنیکی مطالعہ (۱۹۴۷ء)، بک وائز، میاں چیمبرز ٹمپل روڈ لاہور، ۱۹۸۸ء، ص ۳۴۴